تاریخ شیعہ کا پہلا ورق

خطیب اکبر لسان الشعراء مولانا سید اولاد حسین صاحب شاعرؔ اجتہادی، پبلسٹی افسر رامپور

ہندوستان میں شیعہ آبادی اور اس کا عروج

شیعہ مذہب کیونکر پھیلا؟

اسلام پر یہ عام اعتراض ہے کہ وہ بزور شمشیر پھیلایا گیا۔ کسی منصف مزاج انگریز مصنف نے یہ جواب بھی خوب دیا ہے کہ جن شہسواروں نے ایران و شام کو فتح کیا خود ان کو کن تلواروں نے مفتوح کیا جب کہ آنحضرتؐ کی یتیمی و مفلسی ایک واضح حقیقت ہے۔اس مسکت جواب کے بعد بھی دنیا چپ کیوں نہیں ہوتی اور آریہ ونصاریٰ کی طرف یہ آموختہ بار بار کیوں رٹا جاتا ہے؟ آگ پر پانی اثر کیوں نہیں کرتا؟ شاید یہ اس لئے ہو کہ محل اعتراض غلط باور کیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے ہمیشہ مدافعانہ جہاد کئے۔ بدر واحد وخندق جن لڑائیوں کو اولیت حاصل ہے، یہ تینوں لڑائیاں مکہ معظمہ کے مشہور قبیلہ قریش کی جد وکد سے وقوع میں آئیں۔ بدر کے سرکردہ حضرت ابوجہل تھے اور احد و خندق کے بطل اعظم حضرت ابوسفیان پدر حضرت معاویہ۔

پہلی جنگ چشمہ بدر اور دوسری مدینہ منورہ کے مشہور پہاڑ احد، اور تیسری لڑائی خود مدینہ کی حصاری دیوار کے قریب واقع ہوئی۔تم جغرافیہ کا نقشہ اٹھا کر دیکھو کہ یہ مقامات مکہ سے کتنی دور اور مدینہ سے کتنے نزدیک ہیں۔ جارحانہ پیش قدمی کس نے کی اور مدافعانہ کشش وکوشش کا فریضہ کس نے پورا کیا، مگر فتوحات شام وایران ومصر میں مسلمان چڑھ کر گئے تھے یا کفاران کے ملک پر چڑھ کر آئے تھے؟ کس کی قوت جارحانہ اور کس کی حیثیت مدافعانہ تھی؟ یہ نومسلم جماعت بیت المقدس میں شمشیر رانی کر رہی تھی یا اسوۃ الرسول کی تلقین وتبلیغ کر رہی تھی۔ آتش پرستان عجم کا مقابلہ شعلہ ورشمشیر سے ہو رہا تھا یا تعلیم قرآن سے روشنی پھیلائی جا رہی تھی، اس کا جواب بھی جغرافیہ کے نقشہ اور تاریخ سے لو اور آریہ ونصاریٰ کے اعتراض پر غور کرو۔

کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است

ہاں! بقول رسولؐ صرف مدینہ ہی کو کہا جا سکتا ہے کہ اس کو قرآن نے فتح کیا، لیکن جنود اسلامی کے جرنل سعد بن ابی وقاص نے عجم کے فاتحین سے حفظ قرآن کے متعلق دریافت کیا تو بشرا لخثعمی نے کہا مجھے تو صرف بسم اللہ الرحمن الرحیم یاد ہے اور معدیکرب نے اس سے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ شغل جہاد نے مشغول کر لیا سارے لشکر میں صرف سات[1] قاری نکلے۔ یہ ہے اس تعلیم قرآن کی حقیقت جس پر مسلمانوں کو ناز ہے۔

دوسروں کا ملک چھیننے، قتل وغارت پر مسکرانے، اموال غیر جمع کرنے، بیکس کنیزوں، ناچار غلاموں کی تقسیم سے اگر کوئی ذات محفوظ ہے تو وہی علیؑ جو اپنی اور اپنے خاندان کی تباہی منظور کر سکتا تھا مگر اسوۃ الرسول میں ترمیم پر راضی نہ تھا۔لطف یہ کہ ہنگامہ عام نے اس عہد کو بھی حرب وضرب سے خالی نہ رکھا۔ آپ سے بھی تین لڑائیاں ہوئیں مگر علیؑ بھی آنحضرتؐ کی طرح مدافعت کرتے نظر آئے۔ وہی عرب کا نقشہ اٹھاؤ اور دیکھو کہ بصرے والے ملکی سرحد میں کہاں تک چڑھ آئے تھے اور شام سے ساحل فراط میدان صفین کتنی دور ہے۔

اصل تو یہ ہے کہ خلافت کے بنیادی اصول میں جب سے

---

(۱) اصابہ، ج ا ص ۲ ۱۷ مطبوعہ مصر

جبر شریک کیا گیا، اس وقت سے مسلمانوں میں صدق شعاری وحق پرستی کے جذبات فنا ہوتے گئے۔ شیعہ قوم تو تقیہ کے برکات سے محفوظ ہوگئی مگر جن کے یہاں تقیہ نہ تھا ان کے یہاں یہی ناشدنی رسوم ضمیر بن گئے۔ اگر چہ تقیہ صرف شیعوں میں ہے مگر وہ کون ہے جس نے تقیہ کو حرام کہہ کر بھی تقیہ نہ کیا ہو اور ظالم سے ظالم، رنگیلے سے رنگیلے، شرابی، زانی، فاسق بادشاہوں کی خلافت نہ تسلیم کی ہو، ہاں یہ اور بات ہے کہ واقعات سے یکسر منھ پھیر لیا جائے۔ آپ تاریخ اسلام کا ضرور مطالعہ کیجئے اور تشخص مذہبی، عصبیت فرقہ وارانہ سے پرہیز کر کے مطالعہ کیجئے۔ آپ کو اس ساری تاریخ کا خلاصہ ان تین جملوں میں مل جائے گا: ابتدا میں میدان خونی، اوسط میں محشرستان بغاوت، اور آخر میں شبستان عشرت ہے۔

آپ کو اکثر غلام نظر آئیں گے جنھوں نے اپنے آقا کو بیدردی سے قتل کر کے شاہی حاصل کی، اکثر ایسے سردار ملیں گے جنھوں نے میدان جنگ میں سپہ سالار کو قتل کر دیا۔ بہت سے ایسے شہزادے نظر آئیں گے جنھوں نے باپ کی دعوت جام زہر سے کی، یا قلعوں میں محبوس کر کے مار ڈالا، یا بستروں پر بیدریغ تہ تیغ کیا۔ مگر جب ان احسان فراموش، محسن کش، قاتل پدر و برادر کی سیرت و تاریخ پر نظر پڑے گی تو معلوم ہوگا کہ یہ جملہ صفات حسنہ کے مالک تھے اور ان کی قبروں پر گزر ہو جائے گا تو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ ان کا شمار اولیاء اللہ میں ہے۔

خدا جانے ہماری ابتدا اور انتہا کیا ہے

شیعہ بادشاہوں میں بھی اگر چہ نہ کوئی معصوم ہے نہ محفوظ، مگر ان میں سے کوئی خلافت یا امامت کا مدعی بھی نہیں ہے۔ اس طرح اگر ان میں سے کچھ شراب نوش یا عشرت پرست ہوں تو ان کی کمزوری عام مادیت کے نقطہ نظر سے دیکھی جائے گی اور روحانیت کا مقدس خیال بھی پیدا نہ ہو سکے گا لیکن جب اسے خلاف شرع ممنوع بالنص عادت کو خلفائے اسلام کی سنت جاریہ سمجھا جائے اور اپنی شراب خوری کی سند روحانی دعویداروں کے لب تر سے دی جائے تو البتہ مذہب اسلام کے لئے مضر قرار پائے گی۔ مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ شیعہ سلاطین میں شراب خواری کم اور بغاوت شاذ اور عصبیت معدوم ہے۔ چونکہ خلافت کا بنیادی اصول یا تعمیری خشت اول ہی ذرا کج ہو گیا تھا۔ اس لئے سلطنت اسلام کی دیوار ثریا تک خمیدہ کمر ہوتی گئی۔ شاہی کے لئے تشخیص کوئی نہ تھی، البتہ خلفائے عباسیہ کبھی خوشامد کے طور پر اور کبھی اپنے اثرات کے نفوذ کے لئے بلاد اسلام کے شمشیر بکف بادشاہوں کو خلعتِ شاہانہ کے ساتھ اجازت نامہ شاہی بھی بھیجتے تھے۔ مگر ان کی حقیقت عباسیہ دارالامارہ کے بوسیدہ حجاب سے صاف نظر آتی تھی۔

دنیا من مانی کارروائیاں کر رہی تھی اور خلافت گاہ کو بہر طور چشم پوشی کرنا پڑتی تھی۔ جس نے تلوار سنبھالی وہ خلیفہ یا کم از کم بادشاہ ہو گیا۔ کفار پر ہر طرح کا جبر وظلم جائز رکھا گیا۔ اگر مرد نذر شمشیر ہوئے تو ہزاروں عورتیں بچوں کو گود میں لے کر آگ میں کودنے پر مجبور ہوئیں۔ کفار کے مال و منال بالکل ان کے تھے، خاموش سلطنتوں پر دھاوا ان کا حق تھا، آبادیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا ان کا شیوہ تھا۔ لاکھ لاکھ انسانوں کے قتل کرنے کی قسم کھائی اور اس کو بحسن دعویٰ پورا کیا میدان کے میدان خون سے رنگین کئے اور زمانے کو مسلح بنا کر اپنی خون آشامی کی داد لی۔

شیعہ بادشاہ کم از کم خونخوار نہ تھے۔ ان کا مذہب عجیب و غریب طریقہ سے پھیلا۔ ان کو ملک و دولت بے نظیر ذرائع سے ہاتھ آئی۔ آپس میں بھی جنگ ہوئی اور کفار سے بھی مگر صلح اکثر مطمح نظر تھی۔ شاہانہ غیظ وغضب اگر پوشیدہ نہ تھا تو رحم و کرم کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ کفار کے ممالک پر بھی قبضہ کیا، قلعے بھی چھینے مگر فتح کے بعد کفار کو بھی مذہبی آزادی دی، ان کے معابد کی حفاظت کی، ان کی عزت کو اپنی عزت جانا اور کم از کم کبھی اس لئے جنگ نہیں کی کہ فلاں راجہ کی بی بی خوبصورت ہے۔ کفار نے ان کے درباروں میں بار عام پایا۔ بڑے بڑے عہدوں پر بھی ان کو فائز کیا گیا۔ مگر جب ان کی تاریخ مرتب ہوئی تو دنیا کے ذلیل،

عیوب کے حامل بتائے گئے۔ ہندوستان میں شیعہ بھی ہجرت کر کے آئے، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے استقبال کے لئے خونِ کفار کی سرخ مخمل بچھائی گئی۔ ان کا سب سے پہلا قدم فقیرانہ تھا وہ ہدایت کے لئے نکلے تھے۔ اس لئے تلوار ساتھ نہ تھی، زبان کارِ ذوالفقار کرتی تھی۔ ان کے پہلو میں خنجر نہ تھا، قرآن مجید سے قلعۂ دل مسخر ہوتے تھے۔ فقرائے شیعہ کے حالات کے لئے ایک باب مخصوص کر دیا گیا، اس لئے انشاء اللہ آئندہ بیان کیا جائے گا۔

لیکن آٹھویں صدی ہجری سے شیعہ قوم نے بھی امارت و سلطنت کی طرف عملی اقدام شروع کر دیا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ سب سے پہلے جس سرزمین پر شیعوں کو شہر یارانہ عروج ہوا وہ دکن کی زمین ہے اور سب سے پہلی بار جس سرزمین پر خطبۂ شاہی میں ائمہ اثناعشر علیہم السلام کے اسمائے گرامی بالائے منبر لئے گئے وہ یہی سرزمین ہے۔ اسی زمین پر عراق و ایران و ترکستان و گرجستان کے شیعہ جمع ہوئے اور اپنے ساتھ وہ تبرکات و تحائف بھی لائے جو نقد جاں دے دے کر بچائے گئے تھے (ان تبرکات کا تذکرہ وفہرست کے لئے ایک باب مخصوص ہوگا انشاء اللہ)۔

میر فضل اللہ انجو، ملا طاہر، مشہور علم دوست وزیر محمود گاواں، میر عالم، میر مومن، میر فتح اللہ شیرازی اور ایسے ہی خدا جانے کتنے علماء و فضلا و باکمال، فاتح جنرل، پرجگر سپاہی اسی زمین میں پوشیدہ ہوئے۔ ہماری گمنام تاریخ کا سرمایہ قلعہ شولا پور و احمد نگر کے کھنڈرات، بیجاپور و گلبرگہ سے لے کر حیدرآباد اور کرناٹک تک پھیلا ہوا ہے۔ مگر افسوس کہ ہم کو نشان قبر تک نہیں معلوم۔

ابتداً دکن میں صرف ایک شیعہ خاندان شاہی رونما ہوا، مگر چراغ سے چراغ روشن ہوتا رہا اور آخرکار تمام دکن میں چراغاں ہوگیا یا ہماری روشنی پھیل گئی اور یہ سب کچھ انہیں مولویوں کی کارگزاری ہے جو آج ہر دشنام کے پہلے مستحق ہیں۔ امریکہ و ہندوستان کے متجسس آج یورپ بھر میں واجب الاحترام ہیں مگر شیعہ مولوی سلطنتیں دلوا کر تبلیغ مذہب کر کے بادشاہوں کو شیعہ بنا کر واجب اللعن ہیں۔ ہندوستان سے باہر ایران و ترکستان و عراق و مصر و اندلس بھی شیعہ برکات سے خالی نہیں ہیں، لیکن ان کی جستجو کے لئے ایک مکمل زندگی درکار ہے۔ اور ان بکھرے ہوئے موتیوں کو چننے کے لئے زمانہ کا وسیع دامن چاہئے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ایسی تاریخ جمع ہوجائے تو نہ صرف اردو بلکہ عربی و فارسی میں بھی آپ اپنی نظیر ہوگی۔

درین دریائے بے پایاں درین طوفان شور افزا
دل افگندیم بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖیہَا وَمُرْسٰہَا

سید اولاد حسین، از رامپور اسٹیٹ ۲۲ ردسمبر ۱۹۳۱ء

سلاطین دکن

شیعہ قوم اپنی ابتدا سے ایک مظلوم قوم ہے، اس طبقہ کو خلفائے راشدین کی خلافت کی حقیقت سے انکار ہے اور وہ اجماع و استخلاف وشوریٰ جس نے حضرات ابوبکر وعمر وعثمان کو خلیفہ آنحضرتؐ بنایا اس کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اگر آپ یہ سوال کریں کہ کیوں؟ تو اس کا جواب کتب مناظرہ میں ملے گا جن کی قلت نہیں ہے۔ جس طرح آج مسلمانوں کو انکار ہے کہ گاندھی گول میز کانفرنس میں ان کے نمائندہ نہیں ہیں اور جس طرح نیشلسٹ مولانا شوکت علی کی نمائندگی سے منکر ہیں، اسی طرح شیعہ قوم حضرات خلفائے ثلاثہ کی نمائندگی سے منکر تھی اور منکر ہے۔ لیکن وہ اسلامی حکومت جس کی بنیاد اجماع یا جمہوریت پر پڑی تھی اس میں کم از کم رائے کی آزادی مفقود تھی۔ آج شوکت علی کی نمائندگی کے منحرف نیشنلسٹ بہر طور زندہ ہیں اور ان کی عزت وآبرو بھی محفوظ ہے۔ مگر شیعہ اس گناہ پر جو (جو اختلاف رائے سے زیادہ نہ تھا) واجب القتل تھے۔ چنانچہ عہد بنی امیہ میں ان کا قتل و غارت، خانہ ویرانی واسیری نہ صرف جائز بلکہ شاید باعث ثواب بھی تھی یہاں تک کہ اس بارے میں امیر معاویہ کے احکام تک پائے جاتے ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ صرف خلافت ہی میں نہیں بلکہ دوسرے فروع میں بھی شیعوں کو اختلاف رہا ہے جیسے ارکان نماز

روزہ وغیرہ۔ یہ اعتراض بالکل صحیح ہے مگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ خود حضرات اہلسنت میں بھی یہ اختلاف موجود ہے۔ مثلاً امام مالک کے ماننے والے شیعوں کی طرح ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔ امام شافعی کے یہاں قنوت پڑھنے کا دستور ہے۔ پھر شیعوں کے لئے یہ اختلاف اصولی کیوں قرار دیا گیا اور مالکی وشافعی میں اسی اختلاف کو فروعی کیوں تسلیم کیا گیا اس کا جواب دشوار تر ہے۔

خلفائے عباسی کے عہد میں صرف یہ کہنا کہ ہم شیعہ ہیں اور جان سے ہاتھ دھونا برابر تھا۔ اور یہ سلسلہ ترتیباً سلجوقیہ وغزنویہ کا بھی دستور العمل رہا۔ اسی بنا سے صدیوں تک شیعہ قوم پوشیدہ رہی۔ ان کا اجتماع مذہبی بالکل اسی طرح ناممکن تھا جیسے عیسائی روما کے عروج میں یہودیوں کا اجتماع۔ عہد خلفائے بنی امیہ کے بعد خلفائے عباسیہ نے تختِ خلافت پر قدم جمائے اور اگرچہ اس نام نہاد مذہبی سلسلہ کو قائم رکھنا ان کے لئے بھی ضروری تھا جو ان سے شروع ہوکر خلفائے راشدین سے مل جاتا تھا، مگر کم از کم یہ آل ہاشم میں تھے اور بنی امیہ کے ازلی وابدی مخالف، اس لئے شیعوں کو ایک غیر محسوس سی فضا سانس لینے کے لئے مل گئی یعنی وہ اپنے معتقدات کو امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب کے نام پر تو ظاہر نہ کرسکے مگر امام حسینؑ کے نام پر گاہے بگاہے ان کا اجتماع ہونے لگا اور وہ اپنی مجالس میں بیٹے کے ذریعہ سے باپ کے فضائل بھی بیان کرنے لگے اور اس طرح ان کی تبلیغ مسلسل مگر دھیمی رفتار سے شروع ہوگئی۔ ان خلفا میں بعض نے مجالس کی غایت پہچان لی اور ان مجالس پر خلاف قانون جلسوں کا دفعہ لگا کر عسکرانہ قوت سے مدافعت کرنے لگے۔ بس اتنا فرق تھا کہ ہندوستانی پولیس ڈنڈے برسانے پر قناعت کرلیتی ہے اور عہد عباسیہ کے سپاہی شمشیر رانی پر بھی توکل نہ کرتے تھے بلکہ گھروں کو بھی گرادیتے تھے اور گھر والیوں کو بھی اس جیل خانے میں پہنچا دیتے تھے جس میں اے اور بی کلاس تو کہاں، سی کلاس اپنی تنگی، اپنی تعفن، اپنی تاریکی، اپنی مضرتی سے زڈ کلاس کہے جانے کے قابل تھا۔ اس قسم کی قید وبند اور آزادی کے گلے پر چھری چلانے میں خلیفہ متوکل عباسی کا عہد بہت ممتاز ہے۔

اگر یہ سچ ہے کہ تصنیف کے لئے فضا کا سکون، اور شہر آشوبی کا فقدان ضروری ہے تو ہم سے کسی قسم کی تصنیف کا مطالبہ اپنی تاریخی ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ پھر بھی مذہب کی بقا کے لئے اسناد کی ضرورت تھی لیکن زمانہ کی تنگی قلمی موشگافی کا راستہ بھی نہ پاتی تھی، اس لئے سب سے اہم ضرورت کو مقدم کیا گیا اور امام محمد باقر وامام جعفر صادق علیہما السلام نے مذہبی قانون (فقہ) کی تدوین کر ہی دی، اس لئے کہ قانون ہی پر مدار مذہب ہے۔ اس کے بعد کلام میں بیشتر حصہ امام رضا علیہ السلام کی روایت پر منحصر ہوا اور تفسیر میں امام حسن عسکریؑ نے اپنی نشانی چھوڑی، لیکن جن علوم کا ادب سے تعلق تھا اگرچہ ایک حد تک ان میں بھی جد وجہد کی گئی مگر اس کو کافی نہیں کہا جاسکتا۔ خصوصاً تاریخ کا حصہ بالکل ہی ناتمام رہا۔ اگرچہ بعد میں علامہ طبرسی نے اعلام الوری اور جناب مفید علیہ الرحمہ نے ارشاد اور ابن شہر آشوب نے 'مناقب' پیش کیا مگر اول الذکر دونوں کتابیں تاریخی نہیں کہی جاسکتیں، ہاں سیرت کہہ لیجے اور آخر الذکر کتاب کا براہ راست مناقب سے تعلق ہے اگرچہ ضروریات سیرت سے یہ خالی نہ ہو۔

غرض صرف ہمارے زندہ افراد ہی مردہ نہیں کئے گئے بلکہ اموات کی قبریں بھی رفتہ رفتہ بے نشان ہوگئیں۔ یہی اسباب ہیں کہ اس وقت عربی وفارسی میں بھی ہماری قومی تاریخیں نہیں پائی جاتیں اور اسلاف کے حالات صرف دوسروں کے رحم وکرم ہی سے ہم تک پہنچتے ہیں۔

مؤرخین اسلام کے خصوصیات:

اگر فرقہ وارانہ جذبات کا وجود اس ترقی یافتہ دنیا میں پایا جاتا ہو، اگر گورے کالے کا امتیاز، ہندو مسلم کی تفریق اہل کتاب وغیر اہل کتاب کی تقسیم اب تک زندہ ہو، تو آپ کو یقین رکھنا چاہئے کہ ہمارے جذبات کا لحاظ کئے بغیر اپنے معتقدات کو پیش کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو فرقہ واری اختیار کی ہی گئی، جیسے

عقد حضرت ام کلثوم حضرت خلیفہ ثانی سے۔ اس مضمون میں میرا یہ فریضہ نہیں ہے کہ میں اس نکاح کے عدم و وجود پر بحث کروں لیکن فن تاریخ کی کثیر التعداد مجلدات میں مجھے صرف دو تاریخیں ایسی نظر نہ آئیں جس میں مصنف نے اپنی تحقیق کو دخل دیا ہو اور الفاظ روایت و واقعات بدل نہ گئے ہوں اور بھی اختلاف یہی واقعات کی بوقلمونی کہتی ہے۔۔۔۔۔۔حافظہ نباشد۔

دوسری قسم کے وہ مسلمان مؤرخین ہیں جو سخت روادار تھے۔ انہوں نے کبھی فرقہ نہیں بتایا اور اس طرح حضرات احناف کو کافی فائدہ حاصل ہوا یعنی زید اگرچہ کسی فرقہ سے متعلق کیوں نہ ہو لیکن اس کا مسلم ہونا اس کی حنفیت کی دلیل سمجھا جائے گا۔ ایسے مصنفین نے بھی ہمارا کافی نقصان کیا۔

تیسری قسم کے وہ مؤرخین ہیں جو سرے سے واقعات ہی ہضم کر جاتے ہیں اور آجکل کے مقصد پرست اس حیلہ سے ضعف کو نمایاں کرتے ہیں۔ غرض، ہماری تاریخ کے ساتھ ہمارے اسلاف اور ہمارے قومی کارنامے امتداد زمانہ کی مٹی میں دفن ہوتے چلے گئے اور ہندوستان پر کیا منحصر چھٹی صدی سے پہلے گویا کسی سرزمین پر شیعہ امامیہ آباد ہی نہ تھے۔

ان سب کے بعد اس نئی روشنی میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو ہی گیا کہ جو ہمارے معزز افراد پرانی غارتگری سے محفوظ رہ گئے تھے ان کو بھی اپنے زمرہ میں شمار کرنے لگا، جیسے فردوسیؔ، جیسے غالبؔ، خواجہ آتش لکھنوی اور ایسی بودی دلیلوں سے جن کو دوسری لفظوں میں غرض پرستی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، مثلاً غالبؔ اس لئے شیعہ نہ تھے کہ ان کو نواب صاحب لوہارو نے (جو حنفی المذہب تھے) دفن کرایا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس دلیل سے وہ غرباء وفقراء کس مذہب میں شمار ہوں گے جن کو شہر کی مینوسپلٹیاں دفن کرادیتی ہیں۔ اور اگر یہی دلیل کی قوت ہے تو پٹنہ والوں کو جلد ہوشیار ہو جانا چاہئے۔ ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے میر علی محمد صاحب شادؔ عظیم آبادی سے اقرار شیعیت ہزار بار سنا ہوگا لیکن پچاس برس کے بعد یہ بھی براہ راست حنفی المذہب تسلیم کر لئے جائیں گے۔ اور دلیل یہ ہوگی کہ قبر پر چادریں چڑھتی تھیں۔ اسی طرح مرنے والوں کو بھی آئندہ احتیاط ضروری ہے، جگہ دیکھ کر مرنا چاہئے۔

اسی خطرہ سے ڈر کر میں نے عرصہ سے ارادہ کر لیا تھا کہ میں تاریخ شیعہ لکھنے کی اہم خدمت انجام دوں مگر اب تک اس کا منتظر رہا کہ مجھ سے بہتر کوئی اہل قلم اس فرض کو پورا کرے خصوصاً وہ گروہ جس نے اقدام عمل میں پاؤں کی بہ نسبت گلے پر زیادہ زور دیا ہے مگر ابتک تو مجھے کسی جانب احساس پیدا ہوتے ہی نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں تاریخ لکھنے کے لئے گھسے ہوئے کلک سے پن ہر طرح بہتر ہے، اس لئے کہ کلک والا قلم کشیدہ و ''نظری'' گروہ انگریزی سے میری ہی طرح بالکل کورا ہے۔ دوسرے مولوی کا ہل سست زمانہ شناس ہیں۔ مگر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کیا کر رہا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ صرف مولوی ہی عمل کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ حقیقتاً الزام واتہام کے لئے وہ نشانہ بالکل ٹھیک ہے جس کو مولوی کہتے ہیں، اس لئے کہ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ۔

یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ تاریخ شیعہ کو صدر اسلام سے شروع ہونا چاہئے مگر پھر خلافت کے فرسودہ مضامین زیر قلم آجاتے دوسرے اپنی گرفتاریوں اور دماغی وجسمانی کمزوریوں سے مجھے یہ امید بھی نہیں کہ یہ طویل الذیل مضمون میری زندگی میں ختم ہو سکے گا۔ لہٰذا وطنیت کے غلبہ سے مغلوب ہو کر شیعہ ہندوستان کے حالات سے شروع کرتا ہوں اگر یہی باب تمام ہو گیا تو یہی سمجھوں گا کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ ہندوستان میں بہمنیہ وعادلیہ ونظام شاہیہ وقطبیہ وعمادیہ سلاطین کے بعد سلاطین گجرات وکشمیر، سندھ وٹھٹھ، ممالک شرقی (جونپور)، بنگال و بہار واودھ، رام پور میسور وکرناٹک وغیرہ کے شیعہ امرا وسلاطین کے حالات کچھ کم نہیں ہیں۔

شیعوں کے عروج میں عام اہل اسلام سے جداگانہ طور پر آپ کو تدریج نظر آئے گی اور اس کی بنا یہی ہے کہ شیعہ فوجوں اور

لشکروں کے ہمراہ نہ آئے تھے، انہوں نے فقیری سے امیری حاصل کی جو ان کی دانش ان کی قوت عمل کی گواہ ہے۔ صاحبقران امیر تیمور کے عہد سے ایرانیوں کی آمد ورفت کا دستور عام ہوگیا۔ ہندوستان پر ایرانیت اسی طرح چھانے لگی جیسے آج انگریزیت چھا گئی ہے۔ اگر آج ہیٹ اور سوٹ ترقی وتہذیب کی نشانی ہیں تو کل یہی بدنام عمامہ وعبا عزت کا ذریعہ تھے۔ جیسے آج انگریزی الفاظ کے بغیر اردو کا مضمون قابل وقعت نہیں ہوتا، اسی طرح کل فارسی زبان اظہار خیال کا باوقار ذریعہ تھی اور ہندوستان ہی پر کیا منحصر ہے خود ایران بھی عروج اختر حجاز سے یوں ہی متاثر ہو چکا تھا۔ سعدیؔ و حافظؔ کی شیریں زبانی میں عربی کے شہد کا بڑا حصہ ہے۔ ان دونوں نے فارسی میں عربی کے پیوند کثرت سے لگائے۔ فتح وظفر ایک تیز آندھی ہے، ناتواں پتے ہمیشہ ہوا کا رخ دیکھتے رہتے ہیں اور ہوا کے گھوڑے پر سوار مغرب ومشرق کی سیر کرتے پھرتے ہیں۔ استقلال تو انہیں موجودات کا حصہ ہے جن کو فطرت نے متانت وسکون بخشا ہے، جیسے پہاڑ تیز آندھیوں میں بھی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں مگر اڑتے ہوئے پتے ہمیشہ انہیں سے ٹکراتے ہیں۔ یہی حال آج کو وقار علماء کا ہے۔

یہ اپنا کچھ نہ رکھنے والے معاشرت، تہذیب یہاں تک کہ لباس میں بھی غیروں کے محتاج ہیں اور ہر قوم کے عروج سے متاثر ہونا، دوسروں کی نقل کرنا، غیروں کے ہم زبان بننا ان کے نزدیک ترقی کا راز ہے۔ دیکھ لیجئے کل عمامہ وعبا ذلیل کن تھے اور سوٹ ہیٹ میں عزت محفوظ تھی آج ڈاسن کے جوتے اور ولایتی سرج پر ایمان رکھنے والے چپل اور کھدر پر اتر آئے ہیں۔ جن کی نگاہ میں انگریزیت نجات دارین کا واحد ذریعہ تھی، اب وطنیت وقومیت ہی میں ان کے نزدیک ہر مرض کی دوا مشخص ہے۔ ابتدا تو آج ہی سے ہو چکی مگر پچاس برس بعد یہی گروہ انگریزی تہذیب وتعلیم کو جہالت، انگریزی وضع کو غداری سے تعبیر کرے گا، مگر علماء سو برس پہلے بھی یہی کہہ رہے تھے اور آج بھی ان کی زبان نہیں (رکی) اور مدتوں ان کا بیان یہی رہے گا اگر ابتدا ہی میں انگریزی تعلیم انگریزی تہذیب کا بائیکاٹ ہوجاتا تو پاؤں کی بیڑیاں اتنی نہ ہوتیں، زندان کا قفل زنگ خوردہ آسانی سے کھل سکتا مگر علماء اس وقت بھی متعصب جاہل ناعاقبت اندیش تھے اور آج بھی۔

دربار ہمایوں میں شیعوں کا اجتماع، ان کا عروج کچھ ایسا نہ تھا کہ چغتائی فوج کے احناف نے سہل انگاری ہی میں نجات شیر شاہ کے شکست کے اسباب میں بڑا راز یہی ہے۔ ہمایوں کی شکست، بیرم خاں کی رہبری سے ایران کا سفر، شیعہ بادشاہ سے استمداد، کے قوت بازو سے ہندوستان پر دوبارہ قبضہ یہ بہت بعد کا قصہ ہے۔

سلاطین بہمنیہ کا عہد شیعوں کی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ سلاطین خلجیہ دہلی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سلطان علاوالدین حسن بہمنی کانگوی صوبہ داری سے شاہی پر آمادہ ہوا اور روز جمعہ ۲۴ ربیع الاول ۷۴۸ھ مسجد قطب الدین شاہ میں اعلان بادشاہی کے بعد تخت نشین ہوگیا۔(۱) یہ بادشاہ حنفی المذہب تھا اس لئے بتقلید خلفائے عباسی چتر شاہی کا رنگ سیاہ رکھا گیا، سلطان حسن نے حسن آباد گلبرگہ دکن کی تعمیر کی اور یہی اس کا تخت گاہ تھا۔

بنام حسن خسروی شد تمام
جہان زیر فرمانِ اوگشت رام
بر او رنگِ شاہی برآمد پگاہ
برآورد برسر کیانی(۲) کلاہ
ہماں شہر گلبرگہ شد تخت گاہ
عمارت برآورد چوبر اوج ماہ
بنام حسن شہر شد چوںتمام
نہادند آن را حسن آباد نام

---

(۱) تاریخ فرشتہ، ج ۱ ص ۲۷۷، مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ

(۲) سلاطین بہمنیہ کا سلسلۂ نسب ساسانیان ایران سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بہمن نامہ میں جابجا کلاہ کیانی وغیرہ کا تذکرہ آتا ہے لیکن بہمن نامہ خود قابل اعتبار نہیں ہے اس لئے کہ اس کی تصنیف شیخ اذری سے منسوب ہے اور یہ طے ہو چکا ہے کہ یہ شیخ اذری کا کلام نہیں ہے، کسی گمنام شاعر کا کارنامہ ہے۔

سلطان حسن نے جاہ وجلالت وعدل وانصاف کے ساتھ بادشاہی کی۔ جود وسخا میں بھی حسن نے کافی حصہ لیا۔ نہ صرف دکن کے غربا بلکہ مکہ معظّمہ مدینۂ منورہ کے مساکین بھی اس کے ابر کرم سے تر لب ہوتے رہے۔ تخت نشینی کے بعد پہلا اور بستر موت پر آخری حکم خیرات کا حکم تھا۔ چنانچہ حسب وصیت علماء ومشائخ احناف کو بہت کچھ دیا گیا۔ اور غرّہ ربیع الاول ۷۵۹ھ میں وفات پائی۔ گلبرگہ میں قبر بنی۔ محمد شاہ نے باپ کی قبر پر ایک شاندار گنبد تعمیر کرادیا جو آج تک باقی ہے۔

سلطان محمد شاہ بہمنی باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس نے حدود سلطنت میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا، سرحدوں پر مضبوط قلعے بھی بنائے۔ سلطان حسن تک نظام سلطنت معین نہیں ہوا تھا۔ محمد شاہ نے عہدے معین کئے، اور مستحق ارکانِ دولت کو متعین کیا۔ چتر ہما وتخت فیروزہ اسی کے عہد میں تیار ہوا۔ سلطان محمود شاہ کے عہد میں اس تخت کی قیمت ایک کڑوڑ ہون[1] تخمینہ کی گئی تھی۔ عجب نہیں کہ شاہجہاں کا تخت طاؤس چتر ہما وتخت فیروزہ کے جواب میں بنایا گیا ہو۔

محمد شاہ سلاطین دکن ہی میں نہیں بلکہ اکثر حالتوں میں نام نہاد خلفائے عباسیہ سے بھی بہتر تھا۔ اس نے ماں باپ کی عزت ایسی کی ہے جو صرف غرباہی میں رائج ہے۔ بات کا بڑا دھنی تھا۔ اسلام کے نام پر جان دینے کے لئے تیار تھا۔ اسی نے بعض مسلمانوں کے انتقام میں ایک لاکھ ہندوؤں کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی اور اس قسم کو پورا بھی کیا۔ اس کے عہد میں شیعوں کی تعداد میں اضافہ تو ہوا لیکن خاندان شاہی کے کان میں اب تک لفظ شیعہ نہ پڑا تھا اور شیعہ تو شیعہ خود اہلبیتؑ ہی سے واقفیت نہ تھی۔ چنانچہ سلطان حسن کے بعد ملکہ جہاں نے اپنے سعادت مند فرزند (محمد شاہ) سے حج بیت اللہ وزیارت مدینہ منورہ کی اجازت لی اور بیٹے نے تمام وہ چاندی اور سونا جو باپ نے مصالح دنیوی کے لئے جمع کیا گیا پائی پائی کرکے ماں کے ہمراہ کردیا، اس میں مسکوک وغیر مسکوک طلا ونقرہ شامل تھا، چار سومن سونا اور سات سومن چاندی غیر مسکوک ملکہ جہاں کے ہمراہ ہوئی۔ محمد شاہی کشتی پر آٹھ سومہمانوں کی مہمانی کرتی ہوئی ملکہ جدہ سے مکہ معظّمہ پہنچی اور ریگستان حجاز میں دریائے جود وسخا جوش زن ہوا۔ حج کے بعد ملکہ جہاں مدینہ منورہ آئیں اور سادات کے چار ہزار لڑکے اور لڑکیوں کا اپنے صرف سے نکاح کیا۔[۲]

گنبد خضراء وخاتم النبینؐ کی زیارت کے بعد جنت البقیع کا رخ کیا۔ مزار حضرتِ سیدۃ نساء العالمین بضعۃ الرسول حضرت فاطمہ الزہراؑ پر بھی حاضر ہوئیں۔ اور بہت کچھ خیرات کی۔ پھر امام حسنؑ کی قبر کی زیارت کرکے صدر الشریف سے دریافت کیا کہ حضرت بی بی کے دوسرے فرزند امام حسینؑ کی قبر منور کہاں ہے؟ (یہ تھی اہلبیت کی معرفت جس پر مسلمانوں کو ناز ہے۔ میرا خیال اگر صحیح ہے تو آج کل کے ہندو ہی اس سے زیادہ واقف ہیں) صدر الشریف نے کہا کہ ان کی قبر کربلائے معلیٰ میں ہے اور ساتھ ہی ساتھ یزید کے مظالم اور مدینہ سے روانگی اور کربلائے معلیٰ میں پہنچ کر شہادت کا تذکرہ کیا۔ ملکہ جہاں بے اختیار ہوکر روئیں اور کہنے لگیں مجھے معلوم ہے کہ ماں کو چھوٹے بچے سے محبت زیادہ ہوتی ہے لہٰذا بغیر زیارت امام حسینؑ حضرت بی بی مجھ سے خوش نہ ہوں گی۔ فوراً سفر عراق کا سامان کیا، سامان سفر مہیا ہو رہا تھا کہ ملکہ جہاں نے خواب میں سیدۂ عالم کو دیکھا کہ آپ فرمارہی ہیں کہ میں تیرے حسن اعتقاد سے بہت خوش ہوں اور خدا اور رسولؐ بھی راضی ہیں، تیرا بیٹا تیرا منتظر ہے تو یہیں سے دکن کو واپس چلی جا[1] (سچ ہے محبت کا جواب محبت ہی ہے ملکہ جہاں نے سیدۂ کے فرزند کو یاد کیا تو سیدۂ ملکہ جہاں کے فرزند کو کیوں بھولتیں۔ اہلبیتؑ کی محبت میں بھی ایک ادا اسقدر دلکش ہے جس سے مسلمان تو مسلمان کفار بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اور

---

(۱) فرشتہ، ج ا ص ۲۸۸

(۲) فرشتہ، ج ا ص ۲۸۴ (۳) فرشتہ، ج ا ص ۲۸۵

انہیں باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب بے روح مذہب نہیں ہے) سلطان محمد شاہ نے بہت کچھ توسیع مملکت کے بعد ماہ ذیقعدہ ۷۶۶ ھ میں وفات پائی اور گلبر گہ میں دفن ہوا۔

محمد شاہ کے بعد تاریخ اسلام اپنے پرانے رنگ میں رنگ گئی۔ قتل و غارت وفساد کا بازار گرم ہو گیا، ہوس جہانبانی میں عزیز کشی شروع ہوگئی۔ چنانچہ محمد شاہ کے بیٹے مجاہد شاہ کو داؤد بن سلطان حسن نے بستر بیماری وخواب پر ذبح کیا اور داؤد شاہ کو بھتیجے کے قتل کے بعد حالت نماز میں قتل کیا گیا۔ ۷۸۰ ھ تک یہ سب کچھ ہو گیا۔

داؤد شاہ کے بعد اس کا بھائی سلطان محمود شاہ بن سلطان علاء الدین حسن تخت نشیں ہوا۔ اس کے عہد میں پھر امن واماں کا دور دورہ ہوا اور بادشاہ کی علم دوستی نے اکثر علماء کو جمع کر لیا جس میں شیعوں کی تعداد ممتاز تھی۔ میر فضل اللہ انجو، خواجہ زین العابدین ہمدانی، خواجہ محمد کازرونی (کاظمینی)، ملا محمد قاسم مشہدی ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ میر فضل اللہ انجو کرسی صدارت [1] پر رونق افروز تھے۔ ساتھ ہی ساتھ غلامان ترک کا بھی عروج ہوا جو آخر میں مصائب کا سبب ہوا سلطان محمود نے ۷۹۹ ھ میں وفات پائی اور گلبرگہ میں دفن ہوا۔

سلطان محمود شاہ کے بعد سلطان غیاث الدین بن محمود شاہ نے تخت پر قدم رکھا۔ اس کے عہد میں شیعوں کے اثرات نے ایک زینہ اور بلندی حاصل کر لی تھی، یعنی غیاث الدین تھا تو حنفی المذہب مگر سادات پروری اس کا خاص شیوہ ہو گیا۔ باپ کے عہد سے غلامانِ ترک کا عروج ہو چکا تھا اور وہ اکثر معزز عہدوں پر فائز تھے۔ غیاث الدین نے صاف صاف کہہ دیا کہ سادات پر غلاموں کی حکومت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہی لفظیں تھیں جس سے تغلچیں غلام بادشاہ کا دشمن ہوا اور بادشاہ تغلچیں کی خوش جمال دختر پر عاشق ہوا جو حسن صورت کے ساتھ موسیقی میں بھی کافی شہرت رکھتی تھی۔

تغلچیں نے غیاث الدین کو دعوت کے بہانے سے اپنے گھر بلایا اور بیٹی کے لانے کے حیلے سے بادشاہ کو تنہا کیا۔ پھر طرب نامی خواجہ سرا نے شراب میں بیہوشی دی اور اسی حالت میں دونوں نے مل کر غیاث الدین کو گرفتار کر لیا اور خنجر سے آنکھیں نکال لیں

آنکھیں کھوئیں حسرت دیدار میں۔

غیاث الدین کے ساتھ جو دروازے پر منتظر تھے ان میں سے ایک ایک کو بادشاہ کے نام سے گھر میں بلا لیا گیا اور چوبیس باختیار عہدہ دار ذبح کر ڈالے گئے۔ غیاث الدین کی دو ماہہ سلطنت رمضان ۷۹۹ ھ میں ختم ہوگئی اور تغلچیں نے غیاث الدین کے چھوٹے بھائی شمس الدین کو پانزدہ سالگی میں تخت نشیں کر کے در پردہ خود سلطنت کرنا شروع کر دی۔ اگر چہ غیاث الدین کے عہد میں شیعہ بھی باختیار عہدوں پر فائز تھے مگر یہ سب کے سب قتل سے محفوظ رہے اور بظاہر اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ بادشاہ کی شرابخوری اور اس کی اوباشانہ صحبتوں میں شریک نہ تھے۔

شمس الدین کنیر زادہ تھا اور اس کی ماں مادر غیاث الدین کی لونڈی تھی۔ غیاث الدین کی موجودگی میں اس کنیز کو اپنے فرزند کی شاہی کا وہم بھی نہ تھا۔ تغلچیں کی اس خونخوارانہ تدبیر سے بہت خوشی ہوئی، اس لئے کہ بیٹے کی شاہی کے ساتھ ساتھ یہ خود بھی ملکہ جہاں ہو چکی تھی۔ غرض تغلچیں سے بہت خوش تھی اور تغلچیں بھی اپنی لڑکی کے عشق کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ آخر تحفہ وتحائف کا سلسلہ جاری ہو ہی گیا۔ رفتہ رفتہ ملکہ جہاں اس کے قبضہ میں آ کر رہی۔ ایک طرف تو وہ اپنے بیٹے کو تغلچیں کی متابعت کا حکم دیتی تھیں، دوسری طرف خود سراپا تغلچیں کی تابع تھیں۔ خرد سال شمس الدین کو یہ نہ معلوم تھا کہ اب تغلچیں سے اس کا رشتہ کیا ہے۔ معاملات سلطنت میں شوریٰ کی ضرورت ایک واجبی بات ہے، شمس الدین تو بچہ تھا تغلچیں اور ملکہ جہاں سے پہروں تخلیہ رہا کرتا تھا۔ (تاریخ اودھ کا مضحکہ اڑانے والے اپنے جھوٹ

---

(۱) تاریخ فرشتہ، ج ا ص ۳۰۲

کے ساتھ اس حقیقت پر غور کریں)۔

اس طرف تو عدت سے پہلے ہی تخلیہ اور مشورہ تھا، اُدھر داؤدشاہ کے دونوں لائق بیٹے، فیروز خان واحمد خان جو میر فضل اللہ انجو کے فاضل شاگرد تھے اپنی فکر میں تھے۔ وہ تغلچین کے ان اختیارات مزید سے مضطرب تھے۔ چنانچہ انھوں نے انتقام کی ٹھانی اور شمس الدین کو الٹی میٹم کی صورت میں جو خط لکھا اس میں یہ فقرہ نہایت بامعنیٰ تھا، تغلجیس مخل ناموس است۔[1]

شمس الدین بیچارہ ماں کے ہاتھ میں تھا اور ماں تغلچین کے قدموں میں۔ اس خط کا اثر کیا ہوسکتا تھا۔ آخر سدھو خان جاگیردار ساغر اور فضل اللہ انجو کی کوشش وسعی سے فیروز خاں نے دعویٰ سلطنت کیا اور بہت جلد بادشاہ ہوگیا۔ فیروز شاہ نے اپنے بھائی (احمد خاں) کو خانخانان وامیر الامرا کا عہدہ دیا اور میر فضل اللہ انجو نائب السلطنت اور سدھو خاں سرنوبت ہوئے اور شیعوں کا اختر اقبال اور ایک درجہ بلند ہوگیا۔

ابوالمظفر غازی سلطان فیروز شاہ بہمنی

ماہ صفر المظفر ۸۰۰ھ کی آخری تاریخوں میں فیروز شاہ تخت آبائی پر رونق افروز ہوا اور سلطان علاء الدین حسن کی تلوار کمر میں لگائی۔ شمس الدین کو مکحول کر کے ماں کے ساتھ قلعہ بیدر میں قید کیا (جو باجازت فیروز شاہ آخر میں مکہ معظّمہ چلے گئے اور زندگی بھر شاہی وظیفہ پاتے رہے یہاں تک کہ مکہ معظّمہ میں انتقال ہوا) تغلچین کو غیاث الدین نابینا کے سپرد کیا۔ اگرچہ غیاث الدین نابینا تھا مگر اس نے ایک ہی وار میں تغلچین کا خاتمہ کردیا۔

فیروز شاہ کی سیرت:

فیروز شاہ کا دبدبہ وصولت اپنے اسلاف سے کہیں زیادہ تھا۔ رایان رایانِ بیجانگر جن سے سلاطین بہمنیہ ہمیشہ برابر کی جنگ کرتے رہے، فیروز شاہ کی تلوار نے ان کا سر جھکا دیا۔ آخر دیورائے والیٔ بیجانگر نے اصول ومذہب وقواعد سلطنت وخاندان کے خلاف اپنی لڑکی کا عقد فیروز شاہ سے کیا۔ فیروز شاہ ہی نے وہ تاج نما دستار سب سے پہلے پہنی جو آج تک دکن کی حکومتی اور قومی دستار ہے۔ قلعہ نیکا پور وممالک تلنگ کا بڑا حصہ فیروز شاہ ہی نے فتح کیا۔ ملا داؤد بیدری نے **تحفۃ السلاطین** اسی کے نام سے معنون کی ہے۔ فیروز شاہ نے میر فضل اللہ انجو کی بیٹی سے شہزادہ حسن اور اپنی بیٹی سے میر شمس الدین محمد انجو کا نکاح کیا۔ (شاہی خاندان کا شیعہ طبقہ سے یہ رشتہ شاید پہلا رشتہ ہے۔) بادشاہ پابند صوم وصلوۃ تھا اور کوئی فریضہ کبھی قضا نہیں ہوا۔ اس کے عہد میں چوبیس لڑائیاں ہوئیں اور اکثر میں یہی غالب رہا۔

کمزوری:

فیروز شاہ میں دو کمزوریاں بھی تھیں یعنی وہ شراب نوش بھی تھا اور گانا بھی سنتا تھا مگر ان دونوں عادتوں سے تاویل کے ساتھ اظہار شرمندگی بھی کرتا رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا کہ شراب سے فتنہ انگیزی کی قوت دبی رہتی ہے اور سماع نغمہ سے یادِ خدا پیدا ہوتی ہے مگر میں ان دونوں خصلتوں سے نادم اور طالب مغفرت ہوں۔ غنیمت ہے کہ فیروز شاہ شراب خوری سے نادم تھا اور نبیذ کی صورت میں جواز کا خواہاں ہوکر دنیا کی تباہ کاری میں شاعی نہ تھا۔ بعض نام نہاد خلفا نے اپنا گناہ چھپانے کے لئے نبیذ کو نہ صرف جائز بلکہ عام میں فتوؤں کے ذریعہ سے رائج بھی کردیا تھا۔ رہا سماع نغمہ یا گانا بجانا اس کے لئے کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ جب فقرا کی قبریں اور اولیاء اللہ کی خوابگاہیں ڈھولک کی دستبرد اور مرد رقاصوں کے ۱۶/رانچہ قدوم کی پاکوبی سے محفوظ نہیں تو دربار شاہی کے طبلہ کی مست تھاپ اور پھول سے پاؤں کی تھرک کو کون کہہ سکتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ شریعت تو دونوں جگہ پامال ہے۔ پھر بھی ادبیت یا لطیف شعریت یہیں پائی جاتی ہے۔ چاہے خدا انہیں حلقوں میں پایا جاتا ہو جہاں داڑھیوں کا جنگل کود پھاند سے متحرک رہتا ہے۔

فیروز شاہ کی علم دوستی

ہندوستان کے شاہانہ سلسلے میں صرف دو چار بادشاہ علمی حیثیت سے مشہور ومعروف ہیں۔ ایک محمد شاہ تغلق جو صرف

(۱) فرشتہ، ج ا ص ۳۰۵

معقولات میں دستگاہ رکھتا تھا اور منقول سے معرا ہوکر بھی معقولات سے مطابقت کیا کرتا تھا جو سخط مغالطہ تھا۔ فیروز شاہ کا مرتبہ معقول و منقول میں ایک تھا۔ وہ کتب سماوی کو بہت خصوصیت سے دیکھا کرتا تھا اور افضلیت سرور کائناتؐ اور افضلیت اسلام تمام شرائع سابقہ سے ثابت کرتا رہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ شریعت اسلام کامل اور انجیل و توریت پردہ اور ممانعت شراب کے سے اہم اخلاقی قانون سے خالی ہیں۔ وہ فارسی کے علاوہ دوسری مشرقی زبانیں بھی جانتا تھا اور ہر ایک زبان میں بے تکلف گفتگو کرتا تھا۔ عربی زبان کا ادیب تھا اور اسی زبان سے زیادہ دلچسپی تھی۔ فارسی میں اس کی غزلیں اور رباعیاں بھی ہیں جن میں عروجی تخلص کیا گیا ہے۔ میر فضل اللہ انجو کا شاگرد رشید تھا اور میر فضل اللہ مشہور شیعہ اور علامہ تفتازانی کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ہفتہ میں تین دن، شنبہ، دو شنبہ، چہار شنبہ علمی سرگرمی کے لئے مخصوص تھے اور تخت شاہی اور جشن ملوکانہ کے ہنگامے کو ترک کر کے فیروز شاہ ایک معلم کی حیثیت سے طالب علموں میں آبیٹھا تا تھا جہاں معقول و منقول میں سبق دیئے جاتے تھے۔ منقول میں تفسیر اور معقول میں حکمت و ہندسہ سے فیروز شاہ کا گہرا تعلق تھا۔ ۸۱۰ھ میں بالا گھاٹ قلعہ دولت آباد میں اس نے رصد گاہ بنانے کا حکم دیا تھا اور کام بھی شروع ہوگیا تھا حکیم حسن گیلانی محمود کازرونی (کاظمینی) اس کے نگراں تھے مگر حکیم حسن کی بے وقت موت سے یہ ارادہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

فیروز شاہ کا مذہب:

دنیا کا تو یہ رنگ ہے کہ جس مسلم کے نام سے آثار اسلام پائے جائیں، اسکو زبردستی ہی حنفی المذہب تسلیم کرے اور اس طرح مؤرخین کے سکوت سے بے دلیل فائدہ اٹھایا جائے، لیکن مذہب ایک دستور العمل کا نام ہے۔ ہمارے خیال میں انسانی اعمال کی تقسیم کر کے دیکھنا چاہئے کہ اس کے عمل کو کس مذہب سے خصوصیت حاصل ہے؟ اسلام کے تہتر فرقہ قریب قریب اصول میں زبانی طور سے ایک حقیقت رکھتے ہیں، لیکن فروع میں اس قدر گہرا اختلاف ہے کہ جو شے ایک فرقہ میں نہ صرف جائز بلکہ موجب ثواب بھی ہے۔ وہی دوسرے فرقہ میں حرام مطلق ہے۔ مثلاً نبیذ؛ احناف میں جائز اور شیعوں میں حرام ہے۔ اگر کوئی شخص نبیذ کو جائز سمجھے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو شیعہ کہا جائے۔ اسی طرح اگر کوئی حنفی المذہب تقیہ و متعہ پر عمل پیرا ہو تو اس کو کیوں نہ شیعہ کہا جائے۔ اسی اعتبار سے فیروز شاہ کا مذہب شیعہ تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ فیروز شاہ میر فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا اور میر فضل اللہ کھلے ہوئے شیعہ تھے۔ فیروز شاہ جاہل ہی نہ تھا کسی جاہل کا کسی فرقہ کے خصوصیات پر عمل پیرا ہونا اور بات ہے اور کسی پڑھے لکھے کا کسی مسئلہ خصوصی کو قبول کر لینا اور شے ہے۔

مسئلہ متعہ کا فیصلہ:

فیروز شاہ نے بھرے دربار میں تجدید ازواج کے متعلق سوال کیا۔ علمائے احناف نے بتایا کہ اس میں زیادتی بھی ہو سکتی ہے، مگر اس طرح کہ چار میں سے ایک کو طلاق دیا جاتا رہے اور اس خالی جگہ کی خانہ پری محل نو سے ہوتی رہے۔ اس جواب پر غیرت اسلامی و شاہی راضی نہ ہوئی دوسرے فیروز شاہ جاہل نہ تھا وہ یقینا واقف تھا کہ بے سبب طلاق نہ صرف ممنوع ہے بلکہ آنحضرتؐ نے وعید عذاب سے نذارت بھی فرمائی اور بظاہر بھی ایک کھلا ہوا ظلم ہے۔ بادشاہ نے اس مسئلہ پر کافی بحث کی اور کسی جواب سے اس کی تسکین نہ ہو سکی، آخر میں میر فضل اللہ انجو سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا اور انہوں نے مذہب امامیہ کا مختار پیش کرتے ہوئے یہ بھی دعویٰ کیا کہ متعہ خود آنحضرتؐ اور حضرت خلیفہ اول کے عہد میں جائز اور عام اہل امت میں رائج تھا، اس کو حضرت خلیفہ ثانی نے کسی خفیہ وجہ سے حرام کیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت خلیفہ ثانی کو شریعت میں ترمیم کا کوئی حق حاصل نہ تھا، وہ بہ ہزار دشواری اگر کہے جا سکتے تو حافظ شریعت، صاحب شریعت بالاتفاق نہ تھے۔

علمائے احناف نے حسب عادت اس سے انکار کیا اور

کتب صحاح ستہ دربار میں آگئیں۔ بادشاہ نے اپنی آنکھ سے جواز متعہ دیکھا اور بھرے دربار میں جواز متعہ تسلیم کرلیا۔ اس پر علمائے احناف نے کافی طور سے تاویلی شور مچایا مگر فیروز شاہ جاہل نہ تھا۔ آخر علمائے حنفی کو خاموش ہونا پڑا اور بادشاہ نے اسی روز آٹھ سو عورتوں سے (۱) متعہ کیا۔

عشرت خانہ میں علمی جدت:

متعہ کے جواز کا حل ہو جانے کے بعد بادشاہ نے فیروز آباد کی تعمیر کی جس میں بہت محلات تھے اور ہر محل ایک بیگم سے مخصوص تھا۔ بادشاہ کے ازواج میں عرب، عجم، ترک، گجراتی، مرہٹی وغیرہ بیگمیں تھیں اور جس ملک کی خود بیگم تھی اسی ملک کے خادم اور کنیزیں بھی ہوتی تھیں، غیر زبان جاننے والی عورت اس محل میں داخل نہ ہوسکتی تھی۔ گویا فیروز شاہ نہ چاہتا تھا کہ زبانِ خاص میں نقص پیدا ہو۔ عرب میں اس کے کارندے رہا کرتے تھے جو عربی کنیزیں اور غلام بھیجا کرتے تھے۔ بادشاہ ان بیگمات سے ان کی اصلی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ اس کی عدالت کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ہر بیگم یہ جانتی تھی کہ مجھ سے زیادہ بادشاہ کسی کو دوست نہیں رکھتا۔

دیورائے کی بیٹی سے عقد:

بیجانگر کی ہندو حکومت کسی بادشاہ اسلام کی کبھی مطیع نہ ہوئی تھی اور ہمیشہ برابر کی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ۸۰۹ھ میں ولی عہد بیجانگر نے فیروز شاہ کے ممالک میں دخل و تصرف کیا جس کا جواب فیروز شاہ کی طرف سے یوں دیا گیا کہ خود دار السلطنت بیجا نگر تک بھگاتا ہوا گیا۔ بیجانگر کی دیواروں کے نیچے شرائط ذیل پر صلح ہوئی:-

(۱) راجہ اپنی عزیز بیٹی کو نکاح میں دے۔ (۲) پانچ من موتی۔ (۳) پچاس ہاتھی۔ (۴) دو ہزار کنیز و غلام۔ (۵) قلعہ نیکا پور جہیز میں دیا جائے۔ آخر یہ سب شرائط پورے کئے گئے اور فیروز شاہ کامیاب واپس ہوا۔

آخری جنگ اور شکست:

۸۲۰ھ میں فیروز شاہ نے پھر دیورائے سے جنگ کی اور قلعۂ گولکنڈہ (حیدرآباد) کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ دو سال جاری رہا اور اسی زمانے میں فوجِ شاہی میں ہیضہ بھی پھوٹ پڑا۔ دیورائے بھی کثیر فوج سے آپہنچا۔ عین گرمی جنگ میں جب کفار کا طلیعہ شکست ہو چکا تھا اور میر فضل اللہ انجو میمنہ پر حملہ کر چکے تھے، قریب تھا کہ کفار کا میمنہ بھی ٹوٹ جائے کہ سید کے نمک حرام نمک خواروں میں سے ایک نے پس پشت سے سر پر تلوار لگائی اور سید مرحوم کو شہید کر دیا۔ اس شخص سے دیورائے نے امارت کا وعدہ کیا تھا۔ آخر فیروز شاہ کو شکست ہوئی اور نہ صرف شکست بلکہ اکثر ممالک بھی ہاتھ سے نکل گئے اور مسلمانوں کا قتل عام اور مساجد کا انہدام بھی ہو کر رہا۔ اگر چہ احمد خاں خانخانان برادر فیروز شاہ نے یہ ممالک دوبارہ واپس لے لئے مگر پیرانہ سری میں اس شکست سے فیروز شاہ کا دل ٹوٹ گیا۔ آخر یہی غم مرض الموت ثابت ہوا۔ فیروز شاہ کے عہد میں سید محمد گیسودراز (جو آج غریب نواز مشہور ہیں) گلبرگہ میں وارد ہوئے۔ یہ بھی شیعہ تھے۔ ان کا ذکر بھی باب فقراء شیعہ میں انشاء اللہ کیا جائے گا۔

(باقی آئندہ)

بقیہ۔۔۔وفائے عہد

ابوجندل کو حکم دیا کہ تم مکہ فوراً واپس جاؤ۔ ہم مشرکوں سے عہد کر چکے ہیں اس لئے مجبور ہیں۔ تمہیں پناہ نہیں دے سکتے۔ ابوجندل! صبر سے کام لو تم عنقریب اس قید سے آزاد ہو جاؤ گے۔

سرور کائنات نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ اسلام کے نزدیک بلند ترین انسان وہی ہوسکتا ہے جو عہد و قرار کی بھرپور پابندی کرے اور کوئی بات نہ کرے جس سے عہد کی خلاف ورزی کی جھلک پیدا ہوتی ہو۔ ✡✡✡

---

(۱) فرشتہ، ج۱ ص ۳۰۷